AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 04 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

Reflections of Marginalized Identities in Qasmi's Rural Society-Based Fiction: An Analytical Study in the Context of Cultural Studies

قاسمی کے دیہی معاشرت پر مبنی افسانوں میں حاشیہ بردار شناختوں کی عکاسی: کلچرل اسٹڈیز کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر اسد محمود خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو منہاج یونیورسٹی، لاہور
assadphdir@gmail.com

Abstract

This research explores the representation of subaltern identities in the rural-sociocultural short stories of Ahmad Nadeem Qasmi through the lens of Cultural Studies. Qasmi, a prominent figure in Urdu literature, presents complex narratives of marginalized individuals, particularly from agrarian and underprivileged classes. His stories bring forth the intersection of social hierarchies, power dynamics, and class oppression in the rural landscape of Pakistan. Using the theoretical framework of Cultural Studies—especially concepts of power, hegemony, and representation—this study analyzes how Qasmi gives voice to the voiceless through realistic characters and settings. It also examines how these narratives challenge mainstream discourses and cultural stereotypes. The study draws on select short stories that vividly depict the daily struggles, silences, and suppressed identities of peasants, women, and lower-class individuals. This research aims to highlight Qasmi's humanistic vision and his subtle resistance against cultural marginalization. The findings suggest that his fiction not only reflects social realities but also works as a literary act of resistance against oppression and exclusion.

Key Words: Cultural Studies, Subaltern Identities, Rural Fiction, Urdu Literature, Social Marginalization, Power Dynamics

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 04 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

(ملخّص)

یہ تحقیق احمد ندیم قاسمی کے دیہی معاشرت پر مبنی افسانوں میں حاشیہ بردار شناختوں کی عکاسی کو **کلچرل اسٹڈیز** کے تناظر میں جانچتی ہے۔ قاسمی اردو افسانے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، جنہوں نے معاشرتی ناہمواری، طبقاتی جبر، اور پسماندہ طبقات کی زندگی کے حقائق کو سادہ مگر مؤثر بیانیے میں پیش کیا۔ اس مطالعے میں کلچرل اسٹڈیز کے نظریاتی فریم ورک ـــــ خصوصاً طاقت، نمائندگی، اور ثقافتی بالادستی جیسے تصورات ـــــ کا اطلاق کرتے ہوئے ان کرداروں کی شناخت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو عام طور پر معاشرتی حاشیے پر رکھے جاتے ہیں، جیسے کسان، غریب، اور عورتیں۔ تحقیق میں ان افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں حاشیہ بردار طبقے کے روزمرہ مسائل، خاموشیاں اور جدوجہد نمایاں ہیں۔ یہ مطالعہ واضح کرتا ہے کہ قاسمی کا افسانوی بیانیہ صرف حقیقت نگاری نہیں بلکہ ثقافتی جبر کے خلاف ایک نرم مزاحمت بھی ہے۔ اس تحقیق کا مقصد نہ صرف قاسمی کے انسان دوست تصور کو اجاگر کرنا ہے بلکہ اردو افسانے میں نئی تنقیدی راہیں کھولنا بھی ہے۔

کلیدی الفاظ : کلچرل اسٹڈیز، حاشیہ بردار شناختیں، دیہی افسانہ، اردو ادب، سماجی حاشیہ بندی، طاقت کا بیانیہ

قاسمی کے دیہی معاشرت پر مبنی افسانوں میں حاشیہ بردار شناختوں کی عکاسی: کلچرل اسٹڈیز کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ

(1)

ادب اور ثقافت کا رشتہ ہمیشہ سے باہمی اور غیر منفک رہا ہے۔ ادب نہ صرف ثقافت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ خود بھی ایک ثقافتی مظہر کے طور پر تشکیل پاتا ہے۔ یہ محض جذبات یا تخیل کی تخلیق نہیں بلکہ اس میں سماجی ڈھانچے، طاقت کے نظام، طبقاتی تفریق، اور شناخت کی سیاست گہرائی سے سرایت کیے ہوتے ہیں۔ جب ہم ادب کو بطور "متن" پڑھتے ہیں، تو درحقیقت ہم کسی مخصوص معاشرتی اور ثقافتی پس منظر کو بھی Decode کر رہے ہوتے ہیں۔ ادب، خاص طور پر بیانیہ اصناف جیسے ناول اور افسانہ، اس لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ فرد اور سماج کے درمیان موجود کشمکش کو نہایت باریک بینی سے بیان کرتے ہیں۔ افسانہ اردو ادب کی وہ صنف ہے جس نے بیسویں صدی میں تہذیبی، ثقافتی، اور سیاسی تبدیلیوں کو بیان کرنے میں ایک فعال کردار ادا کیا۔ افسانہ نگاروں نے تہذیبی بحران، طبقاتی تضاد، مہاجرت، دیہی و شہری زندگی، صنفی امتیاز، اور نوآبادیاتی اثرات جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں کا حصہ بنا کر ثقافت کے مختلف پرتوں کو نمایاں کیا۔ اردو افسانے کی ابتدا اگرچہ رومانویت سے ہوئی، لیکن ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے نے ایک نئے ثقافتی شعور کو جنم دیا، جہاں ادب کو صرف تفریح یا جمالیاتی تجربے کا ذریعہ نہیں بلکہ سماجی و سیاسی آگاہی کا ذریعہ بھی سمجھا گیا۔ پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اور احمد ندیم قاسمی جیسے افسانہ نگاروں نے ادب کو سماج کا آئینہ بنایا۔ افسانہ، مختصر ہونے کے باوجود، گہرے سماجی اور ثقافتی موضوعات کو پیش

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 04 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

کرنے میں بے نظیر صنف ہے۔اس کی طوالت محدود لیکن اثر گہرا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار مختصر سے مکالمے، منظر نامے، یا علامت کے ذریعے ایک مکمل ثقافتی منظر کشی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔جب ہم افسانے کو کلچرل اسٹڈیز کے تناظر میں دیکھتے ہیں، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سادہ سا افسانہ بھی طاقت کے بیانیوں، طبقاتی ساخت، شناخت کے بحران، اور ثقافتی حاشیہ بندی جیسے بڑے نظریاتی مباحث سے جڑا ہوا ہو سکتا ہے۔ قاسمی کے افسانے اس کی روشن مثال ہیں، جہاں دیہی ثقافت کے مختلف مظاہر — جیسے زمین داری نظام، مذہبی اقدار، عورت کی حیثیت، اور دیہی معیشت — کا مطالعہ نہ صرف ایک سماجی دستاویز کے طور پر ممکن ہے بلکہ ایک نظریاتی مطالعہ بھی مانگتا ہے۔ یوں اردو افسانہ محض بیانیہ نہیں بلکہ ایک "ثقافتی دستاویز (Cultural Document) " ہے، جو اپنے قاری کو نہ صرف محظوظ کرتا ہے بلکہ اس کے فکری نظام کو چیلنج بھی کرتا ہے۔افسانہ لکھنے والا تخلیق کار جب دیہی عورت یا غریب کسان کی خاموشی کو بیان کرتا ہے تو وہ دراصل ایک ثقافتی و سماجی بحران کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، ثقافت اور نظریہ ایک دوسرے سے جُڑتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے درمیان باہمی تعلق کا کھولتے ہوئے، وزیر آغا(1) رقمطراز ہیں :

> "تہذیب اور ثقافت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ثقافت تخلیقی رخ ہے
> اور تہذیب تقلیدی رخ۔ ثقافت فنون لطیفہ، سائنس کی دریافتوں
> اور ایجادات کے علاوہ عام زندگی میں اپج، تنوع اور روحانی یافت کی
> صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے مگر تہذیب مزاجاً رجحان نقل کی تابع
> ہے۔ماڈل کے مطابق مصنوعات تیار کرنا اس کا وظیفہ حیات ہے۔"

کلچرل اسٹڈیز بیسویں صدی کی دوسری نیم میں ابھرنے والی ایک بین اللسانی، بین الشعبہ جاتی علمی تحریک ہے جو ثقافت کو محض جمالیاتی مظہر کے بجائے ایک نظریاتی اور سماجی مظہر کے طور پر دیکھتی ہے۔اس نظریے کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ ثقافت طاقت، شناخت، اور سماجی ڈھانچے سے جڑی ہوئی ایک پیچیدہ اور متحرک تشکیل ہے۔اس نظریاتی تحریک کی بنیاد برطانیہ میں 1964 میں برمنگھم اسکول (Centre for Contemporary Cultural Studies) کے قیام کے ساتھ پڑی، جس کے بانی اور رہنما شخصیات میں ریمنڈ ولیمز، رچرڈ ہوگارٹ، اور اسٹوارٹ ہال جیسے دانشور شامل تھے۔ریمنڈ ولیمز نے اپنی کتاب "Culture and Society" (1958) میں یہ تصور پیش کیا کہ ثقافت کسی بھی سماج کی اقدار، رواج، اور طاقت کے ڈھانچوں کا عکس ہوتی ہے۔ان کے نزدیک ثقافت ایک "کلیدی لفظ" ہے جو سماجی تبدیلیوں کو نہ صرف ظاہر کرتی ہے بلکہ انہیں ترتیب بھی دیتی ہے۔ریمونڈ ولیمز(2) لکھتے ہیں:

> "ثقافت عام سی چیز ہے: یہ پہلی حقیقت ہے۔ ہر انسانی معاشرے کی اپنی ساخت، اپنے مقاصد اور اپنے معانی ہوتے ہیں۔ ہر انسانی معاشرہ ان کو اپنے اداروں، فنون، اور علم کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔"

اسٹوارٹ ہال، جنہیں کلچرل اسٹڈیز کے "نظریاتی معمار" کے طور پر جانا جاتا ہے، نے ثقافت کو علامتی تعامل، میڈیا اور زبان کی سطح پر طاقت کی تشکیل و تقسیم سے جوڑا۔ ان کے مطابق ثقافت وہ میدان ہے جہاں طاقت، شناخت، اور معنی کے بیانیے ترتیب پاتے ہیں اور متنازعہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا نظریہ "Encoding/Decoding"، میڈیا مطالعات میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح ذرائع ابلاغ کے پیغامات مختلف طبقے مختلف انداز میں سمجھتے ہیں، جس سے ثقافتی معانی کی کثیر الجہتی نوعیت ظاہر ہوتی ہے، اسٹوارٹ ہال(3) لکھتے ہیں:

> "نمائندگی معنی کی زبان کے ذریعے تخلیق کا عمل ہے۔ یہ تصورات اور زبان کے درمیان وہ ربط ہے جو ہمیں حقیقی دنیا —— اشیاء، افراد یا واقعات —— اور خیالی دنیا —— افسانوی کرداروں، چیزوں اور حالات —— کی طرف اشارہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔"

اس تناظر میں ڈاکٹر وزیر آغا(4) لکھتے ہیں:

> "جہاں ثقافت، فطرت یا نیچر کی تہذیب کرتی ہے، وہاں ادب انسانی خدمات کی تہذیب کرتا ہے۔ انسان کی ذات میں بھی ایک جنگل آباد ہے۔ ادب، جذبات کے اس جنگل کی تقلیب کرتا ہے۔ ادب میں داخل ہوتے ہی جذبات کے پر نکل آتے ہیں اور وہ متخیلہ کی صورت پرواز کرنے لگتے ہیں۔ اس سے جذبات کے تشنج اور گرانباری میں کمی آتی ہے۔"

کلچرل اسٹڈیز کا ایک اہم پہلو اس کا بین الضِمانی (interdisciplinary) ہونا ہے، جس میں یہ نظریہ عمرانیات، لسانیات، ادبیات، ذرائع ابلاغ، اور سیاست جیسے متنوع میدانوں کو مربوط کرتا ہے۔ یہ محض ثقافتی مظاہر کی تشریح تک محدود نہیں بلکہ ان کے پیچھے کارفرما طاقت کے نظام، طبقاتی ساخت، نسلی تفریق، اور صنفی امتیاز کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ قاسمی جیسے افسانہ نگاروں کے کام میں کلچرل اسٹڈیز کا اطلاق ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم ان کے کرداروں، بیانیوں، اور منظر ناموں میں

Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

طاقت اور شناخت کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکیں۔اس نظریہ کا اطلاق خاص طور پر ان ادبی متون پر کیا جاتا ہے جو "مرکزی دھارے" سے باہر کی آوازوں کو سامنے لاتے ہیں اور جن میں معاشرتی یا ثقافتی جبر کی نشاندہی ہوتی ہے۔

کلچرل اسٹڈیز میں طاقت (Power)، نمائندگی (Representation)، اور ثقافتی بالادستی (Cultural Hegemony)کے تصورات کو بنیادی ستونوں کی حیثیت حاصل ہے۔ان تصورات کی مدد سے ہم کسی بھی سماجی یا ادبی متنی بیانیے کو نہ صرف بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس میں موجود گہرے سیاسی اور نظریاتی مفاہیم کو بھی دریافت کر سکتے ہیں۔طاقت کا تصور میشل فوکولٹ جیسے مفکرین کے ہاں صرف ریاستی یا جسمانی جبر تک محدود نہیں بلکہ یہ سماجی نظم وضبط، علم، اور زبان کے ذریعے معاشرے میں سرایت کر جانے والے "Discursive Systems" کے ذریعے کام کرتا ہے۔ ان کے مطابق طاقت کا اثر براہِ راست لاشعوری سطح پر ثقافت اور شناخت کی تعمیر میں ہوتا ہے۔ نمائندگی (Representation)کلچرل اسٹڈیز میں ایک مرکزی اصطلاح ہے جو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ کس طرح مخصوص گروہوں، شناختوں یا طبقات کو میڈیا، ادب، اور دیگر ثقافتی مظاہر میں پیش کیا جاتا ہے۔اسٹوارٹ ہال (5) نے اس موضوع پر اپنی تحقیق میں وضاحت کی ہے:

"نمائندگی محض عکس بندی کا عمل نہیں بلکہ معانی کی تخلیق کا ایک
متحرک اور نظریاتی عمل ہے۔"

یعنی جب کوئی کردار "غریب کسان" یا "کمزور عورت" کے طور پر دکھایا جاتا ہے، تو دراصل وہ ثقافتی نظام میں ایک خاص نظریہ اور طاقت کے تناظر کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔

"ثقافتی بالادستی (Cultural Hegemony) "ایک ایسا فکرانگیز نظریہ ہے جسے انٹونیو گرامشی نے اس مقصد سے پیش کیا کہ طاقت کے ان پوشیدہ اور غیر مرئی ڈھانچوں کو سمجھا جاسکے جو ریاستی جبر کے بغیر بھی معاشرتی ذہن سازی اور اطاعت قائم رکھتے ہیں۔ گرامشی کے مطابق، حکمران طبقات صرف مادی وسائل کے ذریعے غلبہ حاصل نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنی ثقافتی اقدار، خیالات، اور طرزِ زندگی کو 'معقول'، 'فطری' اور 'آفاقی سچ' کے طور پر پیش کر کے عوام کی ذہنی رضامندی حاصل کرتے ہیں۔اس طرح محکوم طبقے نہ صرف اپنی محکومی کو قبول کرتے ہیں بلکہ اکثر اسے اپنی فطری حالت سمجھ کر اس کے جواز میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ اس نظریے کی مدد سے ہم ادب میں ان بیانیوں کو سمجھ سکتے ہیں جو ظاہری طور پر مظلوم طبقات کی ہمدردی میں لکھے گئے ہوتے ہیں مگر لاشعوری طور پر انہی کی غیر مرئی کمزوری کو تقویت دیتے ہیں۔ انٹونیو گرامشی (6) لکھتے ہیں:

"کسی سماجی گروہ کی بالادستی دو طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے: ایک 'غلبہ ' (domination)کی صورت میں اور دوسری 'فکری اور اخلاقی قیادت (intellectual and moral leadership) ' کی شکل میں۔ایک غالب گروہ مخالف طبقات کو یا تو مٹا دیتا ہے یا انہیں کسی نہ کسی شکل میں اپنے تابع کر لیتا ہے — بعض اوقات مسلح قوت کے ذریعے بھی — لیکن وہ ہم خیال اور معاون گروہوں کی قیادت کرتا ہے۔"

اس تناظر میں، ادب — بالخصوص افسانہ — محض تخلیقی اظہار نہیں رہتا بلکہ ایک نظریاتی میدان میں بدل جاتا ہے، جہاں طاقت اور مزاحمت کی علامتی جنگ جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات وہ تخلیقات جو سطح پر مظلوم طبقات کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں، وہ لاشعوری طور پر ان کے استحصال کو مستحکم کرنے والے نظریاتی سانچوں کو دہراتی ہیں۔ گرامشی کا تصور ہمیں ایسے بیانیوں کی تحلیل میں مدد دیتا ہے، جو 'ہمدردی' کے پردے میں ثقافتی بالادستی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ لہٰذا، تنقیدی مطالعہ صرف یہ دیکھنے سے مکمل نہیں ہوتا کہ کون سا کردار مظلوم ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کس بیانیے کے اندر پیش کیا جا رہا ہے اور اس بیانیے کی نظریاتی جڑیں کہاں پیوست ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ان تصورات کی گونج واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان کے کردار، منظر نامے اور بیانیے طاقت کی ان مختلف پرتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو دیہی زندگی میں موجود ہیں۔ خاص طور پر جب وہ کسانوں، محنت کشوں یا عورتوں کی جدوجہد کو بیان کرتے ہیں، تو ان کے ہاں طاقت اور نمائندگی کا وہی تناؤ موجود ہوتا ہے جو کلچرل اسٹڈیز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح قاسمی کا افسانوی ادب ان تصورات کے اطلاق کا ایک مضبوط کیس اسٹڈی بن جاتا ہے۔

"سب آلٹرن اسٹڈیز (Subaltern Studies) "بیسویں صدی کے آخری ربع میں ابھرنے والی ایک اہم نظریاتی تحریک ہے جس کا مقصد ان طبقات کی تاریخ، شناخت اور آواز کو منظر عام پر لانا ہے جو روایتی تاریخی اور ادبی بیانیوں میں خاموش یا غیر موجود سمجھے جاتے رہے ہیں۔ یہ تحریک بنیادی طور پر جنوبی ایشیائی سیاق میں ابھری، اور رنجیت گہا، گیاتری اسپیوک، اور پارتھا چٹرجی جیسے مفکرین نے اسے علمی بنیاد فراہم کی۔ "سب آلٹرن" کا مطلب وہ طبقات ہیں جو نہ صرف معاشی یا سیاسی طور پر کمزور ہیں بلکہ جن کی ثقافتی شناخت کو بھی مرکزی دھارے میں جگہ نہیں دی جاتی، جیسے کسان، عورتیں، اقلیتیں، اور مزدور۔ گیاتری اسپیوک کا مشہور مضمون "Can the Subaltern Speak?" اس بحث کی بنیاد بناتا ہے کہ کیا

AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 04 (2025)
Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

حاشیہ بردار افراد کی آواز سنی جاسکتی ہے یا وہ ہمیشہ طاقتور بیانیے کے ذریعے ہی "مترجم" ہو کر سامنے آتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت خاص طور پر ادب میں بڑھ جاتی ہے، جہاں اکثر اوقات مظلوم کرداروں کی شناخت مصنف کی زبان اور نقطہ نظر سے مشروط ہو جاتی ہے۔ گایتری چکرورتی اسپیواک (7) کہتا ہے:

> "سب آلٹرن (حاشیہ بردار طبقہ) بول نہیں سکتا؛ دنیا بھر کی مظلوموں کی فہرستیں بنانے میں کوئی خوبی نہیں، جب عورت کو محض ایک نیک اور مظلوم شے کے طور پر پیش کیا جائے کہ نمائندگی کا مسئلہ اب بھی باقی ہے۔"

قاسمی جیسے افسانہ نگاروں کی تحریریں ان ہی سوالات کو جنم دیتی ہیں۔ جب وہ ایک دیہی عورت کی خاموشی، ایک بوڑھے کسان کی بے بسی، یا کسی مزدور کی آنکھوں سے دنیا کو دکھاتے ہیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا یہ اصل آواز ہے یا صرف نمائندگی؟ "Representation of the Marginalized" کا تصور سب آلٹرن اسٹڈیز سے جڑا ہوا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ادب، فلم، یا میڈیا میں وہ طبقات کیسے پیش کیے جاتے ہیں جو طاقت کی مرکزی فضا سے باہر ہیں۔ ان کی نمائندگی یا تو ان کی مظلومیت کو رومانوی رنگ دیتی ہے یا ان کے مسائل کو سطحی بنا کر پیش کرتی ہے۔ تاہم، قاسمی کے ہاں یہ نمائندگی ایک خام اور حقیقی انداز میں سامنے آتی ہے۔ ان کے کردار محض "مظلوم" یا "جذباتی" نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے محدود دائرے میں شعور، مزاحمت اور شناخت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قاسمی کا افسانوی فن سب آلٹرن اسٹڈیز کے تناظر میں نہ صرف قابل مطالعہ بلکہ قابل قدر بھی بن جاتا ہے۔

یہ نظریاتی زاویے ہمیں اس بات کی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ ادیب کا کردار محض کہانی سنانے والا نہیں بلکہ سماج میں غیر مرئی طبقات کی شناخت کے اظہار کا وسیلہ بھی ہے۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی کے افسانے نہ صرف ادبی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ایک نظریاتی و سماجی مکالمہ بھی پیدا کرتے ہیں جس میں "خاموش طبقات" کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(2)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہی معاشرت کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ صرف مناظر یا زبان کی سطح پر دیہی نہیں، بلکہ اس میں تہہ در تہہ ثقافتی شناختوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ قاسمی نے نہایت باریکی سے ان کرداروں کو پیش کیا ہے جو "مرکزی ثقافتی بیانیے" سے ہٹے ہوئے، یعنی حاشیے پر موجود ہیں۔ ان کے دیہی کردار نہ صرف طبقات میں منقسم ہیں بلکہ جنس، پیشہ، رسم و رواج، اور مذہبی اثرات کے تحت بھی مخصوص شناختوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کلچرل اسٹڈیز کے

زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کردار وہ مقام رکھتے ہیں جہاں طاقت اور ثقافت کی کشمکش سامنے آتی ہے، اور شناخت کوئی جامد یا سادہ شے نہیں بلکہ مسلسل تشکیل پانے والا، متحرک عمل بن جاتی ہے۔ کلچرل اسٹڈیز کا تصور ہے کہ شناخت محض فرد کی ذات سے نہیں، بلکہ اس کے مقام، رشتوں، اور سماجی تعلقات سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسٹوارٹ ہال اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شناخت "کبھی مکمل نہ ہونے والا، بدلتا ہوا، اور بیانیہ عمل" ہے۔ قاسمی کے ہاں بھی یہ شناختیں جامد نہیں بلکہ بدلتی رہتی ہیں: افسانہ پرندہ میں لڑکا اور پرندہ دونوں شناخت کے اُس استعارہ کی صورت اختیار کرتے ہیں جو قید اور آزادی، اختیار اور مجبوری کے درمیان جھولتی ہے۔ یہاں شناخت صرف ایک فرد کی نہیں، پورے سماج کی روحانی اور نفسیاتی حالت کا پتا دیتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قاسمی نے اردو افسانے کو نہ صرف جمالیاتی بلندی دی بلکہ اس کے ذریعے دیہی معاشرت کی تہذیبی، ثقافتی، اور سیاسی جہات کو بھی ایک ایسے انداز میں پیش کیا جو کلچرل اسٹڈیز جیسے جدید نظریاتی زاویوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے افسانوں میں شناختیں کسی بھی کلیشے کا شکار نہیں، بلکہ وہ سوالات اٹھاتی ہیں، تہذیبی بحرانوں کو ظاہر کرتی ہیں، اور قاری کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ طاقت کے ان نظر نہ آنے والے نظاموں پر غور کرے جو ہماری ثقافتی حقیقتوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد(8) رقمطراز ہیں:

> "قاسمی کا دیہات فقط فطری دلکشی کا مظہر نہیں، بلکہ ایک ایسا سماجی منظر نامہ ہے جہاں زندگی کی بنیادی جدلیات اور تضادات نہایت فنکارانہ چابک دستی سے مجسم ہوتے ہیں۔ ان کی واقعیت نگاری اور مشاہداتی بصیرت نے پنجاب کے مخصوص پس منظر اور علاقائی تہذیب کو اردو افسانے کے مرکزی دھارے میں شامل کر کے اسے وسعت دی۔"

قاسمی کے افسانے "ماں جی"، "گنڈاسا"، "کفن"، "پرندہ" اور "گاؤں والا" جیسے متون ان معاشرتی پرتوں کو بے نقاب کرتے ہیں جہاں دیہی فرد کی شناخت صرف زمین، پیشہ یا زبان کی بنیاد پر متعین نہیں ہوتی بلکہ وہ مقامی رسمیات، طبقاتی تفاوت، صنفی کردار اور مذہبی شعور سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ افسانہ ماں جی میں بوڑھی عورت کی شناخت صرف ایک ماں یا نگران کی نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی علامتی وجود ہے جو دیہی ثقافت کے اندر عورت کی قربانی، خاموشی، اور غیر دیکھی جانے والی طاقت کا نشان بن جاتی ہے۔ اسی طرح گنڈاسا جیسے افسانے میں طاقت، مردانگی، اور دیہی روایت کا بیانیہ کرداروں کی ثقافتی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی(9) کے ایک افسانے "عالاں" کا منظر نامہ دیکھئے:

"وہ وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اماں بولیں: 'اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں، برا نہ ماننا۔۔۔ نیت بری نہ ہو تب بھی نظر لگ جاتی ہے! ابھی پچھلے دنوں نوراں نے مجھے مکھن کا پیڑا نکالتے دیکھا تھا تو دوسرے دن مرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکلا۔۔۔ اور اس سے اگلے دن چڑیا کے انڈے کے برابر۔۔۔ گائے کو تین دن مرچوں کی دھونی دی تو نظر اتری۔"

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں عورت کی شناخت صرف ایک روایتی، مظلوم کردار تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ ایک ایسا علامتی پیکر بن جاتی ہے جو دیہی ثقافت کی تہذیبی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ افسانہ "وحشی" کا کنڈیکٹر اور بوڑھی اماں کا کردار صرف ایک نگہبان یا جذباتی مرکز نہیں بلکہ وہ ایک ایسے ثقافتی کوڈ کا حصہ ہے جو عورت کو "قربانی" اور "خاموشی" سے جوڑ دیتا ہے۔ وہ ماں جسے پورا گاؤں عزت دیتا ہے، وہ اندر سے خود اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسٹوارٹ ہال کے مطابق شناخت وہ عمل ہے جو "ثقافتی بیانیوں کے ذریعے مسلسل تیار اور دوبارہ تشکیل پاتا ہے"، اور یہی ہمیں قاسمی کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ افسانہ "گاؤں والا" میں نوجوان لڑکی کی شادی کے ضمن میں پیش آنے والی روایتی گفتگو عورت کو "سماجی لین دین" کے ایک آلے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یہاں عورت کی ثقافتی شناخت مرد کے فیصلوں، معاشی حالات، اور مذہبی اقدار کے بیچ تشکیل پاتی ہے۔ قاسمی (10) کہتے ہیں:

"میں تو کہتا ہوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو، بس میں سفر نہیں کرے۔ اب اس مائی کو دیکھیے، میو ہسپتال کے اسٹینڈ سے بس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے، کہتی ہے والٹن جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی۔ اس لیے کہ کسی نے اسے چار آنے ہی دیے ہیں۔"

مذہب بھی قاسمی کے افسانوں میں ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے، لیکن نہایت پیچیدہ انداز میں۔ مذہب کو محض عبادت یا اخلاقیات کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک طاقتور ثقافتی حوالہ کے طور پر برتا گیا ہے۔ افسانہ "گنڈاسا" میں مذہب کا ذکر ایک ایسے پس منظر میں آتا ہے جہاں طاقت اور زمین داری نظام غالب ہے۔ کرداروں کا مذہبی حوالوں سے جواز تلاش کرنا در اصل ثقافتی جڑوں کو مضبوط کرنے کی کوشش ہے۔ کلچرل اسٹڈیز میں مذہب کو ایک "ثقافتی مظہر" کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو سماجی اداروں کے ساتھ مل کر

Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

شناخت سازی میں کردار ادا کرتا ہے۔ قاسمی کے ہاں بھی مذہب ثقافتی شناخت کو مستحکم کرنے والا عنصر ہے لیکن بعض مواقع پر یہی مذہب حاشیے پر موجود طبقات کے لیے جبر کا آلہ بھی بن جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی زبان محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ ثقافت کا ایک زندہ مظہر ہے۔ان کے افسانوں میں استعمال ہونے والی زبان علاقائی لہجوں، دیہی اصطلاحات، اور محاوراتی انداز سے مزین ہوتی ہے، جو نہ صرف کرداروں کو حقیقت سے قریب تر بناتی ہے بلکہ ایک مکمل ثقافتی فضا پیدا کرتی ہے۔ کلچرل اسٹڈیز میں زبان کو محض "sign system" نہیں بلکہ ایک ایسا آلہ سمجھا جاتا ہے جو طاقت، نظریہ، اور شناخت کی تشکیل میں براہ راست شریک ہوتا ہے۔ قاسمی جب مقامی زبان اور روزمرہ بول چال کا استعمال کرتے ہیں، تو وہ نہ صرف اپنے کرداروں کو authenticity بخشتے ہیں بلکہ ایک ایسے ثقافتی ورثے کو محفوظ کر رہے ہوتے ہیں جو جدیدیت کے دباؤ میں مٹنے کے خطرے سے دوچار ہے۔افسانہ "کفن دفن" میں ایک مردہ عورت کی لاش اور اُس کے گرد ہونے والی گفتگو، نہایت سادہ زبان میں، ایک ایسے نظام پر تنقید ہے جو مرنے کے بعد بھی عورت کو مکمل عزت دینے سے قاصر ہے۔ یہاں "کفن" خود ایک علامت بن جاتا ہے — وہ ثقافتی بوجھ جسے عورت کو مرنے کے بعد بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ زبان کی سطح پر دیکھا جائے تو افسانے میں استعمال ہونے والی ترکیبیں جیسے "غریب کی بیٹی"، "لوگ کیا کہیں گے" اور "عزت کا سوال ہے" — دراصل وہ کلچرل codes ہیں جو عورت کی شناخت کو تشکیل دیتے ہیں۔ان جملوں کے اندر چھپے ہوئے "طاقت کے بیانیے" کو سمجھنا، کلچرل اسٹڈیز کے نظریاتی فریم ورک کے تحت ممکن ہوتا ہے۔

قاسمی کے افسانوں میں علامتیں اور استعارے صرف ادبی لذت کے لیے نہیں، بلکہ وہ سماج کے گہرے زخموں اور شناختی بحرانوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "پرندہ" افسانے میں پرندے کی قید ایک ایسی علامت بن جاتی ہے جو دیہی معاشرے میں فرد، بالخصوص نوجوانوں کی محدود آزادی کو ظاہر کرتی ہے۔ زبان، استعارہ اور منظر نامہ — یہ سب مل کر ایک ایسی ثقافتی تصویر بناتے ہیں جہاں ہر کردار، ہر واقعہ، اور ہر جملہ کسی نہ کسی سطح پر شناخت کی سیاست کا حصہ ہے۔ قاسمی کے افسانے تنوع، ثقافت اور طبقاتی تفریق کے آئینے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جن میں شناختوں کی ساخت نہایت پیچیدہ اور تہہ دار صورت میں سامنے آتی ہے۔ خاص طور پر "عالاں"، "وحشی"، "کپاس کا پھول"، اور "الحمد اللہ" جیسے افسانے ان کرداروں کو پیش کرتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر سماجی و ثقافتی حاشیے پر موجود ہیں۔ان کرداروں کی شناخت صرف ان کے طبقے یا پیشے سے جڑی ہوئی نہیں بلکہ ان کے مقام، تعلقات، جنس، زبان اور ثقافتی روایات سے بھی وابستہ ہے۔ "وحشی" میں عورت کی شناخت کئی پرتوں میں سامنے آتی ہے — وہ ماں ہے، بزرگ ہے، دیہی تہذیب کی نمائندہ ہے، لیکن ساتھ ہی وہ خود مختاری سے محروم، قربانی کی تصویر بھی ہے۔ یہاں ماں کا کردار عورت کی مخصوص "جینڈرڈ کلچرل شناخت" کی نمائندگی کرتا ہے، جسے

Al-Zumar
Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347
AL-ZUMAR
Vol. 3 No. 04 (2025)

معاشرہ عزت تو دیتا ہے مگر اختیار نہیں۔ "موچی" میں مزدور طبقے کی نمائندگی ہے، جس کی شناخت صرف "محنت کش" کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی طاقت سے بے دخل حیثیت رکھتی ہے، جسے نظام مسلسل استحصال کا شکار بناتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے صرف دیہی زندگی کی سادہ ترجمانی نہیں کرتے، بلکہ ان میں موجود ثقافتی بیانیے، طبقاتی کشمکش، جینڈر پر مباحث، اور مذہبی و تہذیبی شناختیں ایک گہری فکری اور نظریاتی قرأت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ کلچرل اسٹڈیز کے تناظر میں دیکھا جائے تو قاسمی کے کردار ایک "ثقافتی متن (Cultural Text) "کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کے ذریعے ہم طاقت، حاشیہ برداری، شناخت سازی، اور مزاحمت جیسے نظریاتی اصولوں کو عمل میں آتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ تحقیقی جائزے سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ قاسمی کے افسانے محض ہمدردی یا اصلاحی بیانیہ نہیں ہیں، بلکہ ان میں موجود ساختیات ہمیں طاقت کے غیر مرئی نظاموں کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ کلچرل اسٹڈیز کے تناظر میں شناخت کوئی فطری شے نہیں، بلکہ مسلسل تشکیل پانے والا عمل ہے، جو طاقت کے مراکز، سماجی روابط، اور تہذیبی مفروضات کے تحت بنتی اور بگڑتی ہے۔ قاسمی کے کردار اسی تغیر پذیر شناخت کے نمائندہ ہیں: کبھی وہ دیہی سادگی میں لپٹے ہوئے، اور کبھی تہذیبی انتشار کے عکاس بنتے ہیں۔ اس تحقیقی مطالعے سے یہ سفارش اخذ کی جا سکتی ہے کہ اردو افسانے کو صرف جمالیاتی یا بیانیہ تنقید کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے ثقافتی مطالعے، پوسٹ کولونیل تھیوری، اور جینڈر اسٹڈیز کے تناظرات میں بھی پرکھا جانا چاہیے۔ احمد ندیم قاسمی جیسے ادیبوں کے کام میں دیہی پاکستان کی وہ گمشدہ آوازیں محفوظ ہیں جنہیں روایتی ادب میں اکثر نظر انداز کیا گیا۔ لہٰذا، نئی نسل کے محققین کو چاہیے کہ وہ سب آلٹرن شناختوں (Subaltern Identities) پر تحقیقی توجہ دیں، خاص طور پر عورت، کسان، مزدور، اور اقلیتی پس منظر رکھنے والے کرداروں پر تحقیق و تدوین کی ضرورت باقی ہے۔ مجموعی طور پر احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری آج کے تنقیدی منظرنامے میں نہایت موزوں اور قابل توجہ ہے، خاص طور پر جب ہم معاصر دنیا میں شناخت، طاقت، اور نمائندگی کے سوالات سے دوچار ہیں۔ ان کے افسانے اردو ادب میں ثقافتی شعور کی بازیافت اور دیہی حاشیوں کی آواز بن کر سامنے آتے ہیں، جو تحقیق کے دروازے مزید وسیع کرتے ہیں۔

حوالہ جات و حواشی:

(1) آغا، وزیر (2000ء)، "ثقافت، ادب اور جمہوریت"، مشمولہ: معنی اور تناظر (مقالات)، نئی دہلی، انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز، ص 43۔

(2) ولیمز، ریمونڈ (1987ء)، "Culture and Society"، لندن: چاٹو اینڈ ونڈس، ص 13۔

Online ISSN: 3006-8355
Print ISSN: 3006-8347

(3) ہال، اسٹوارٹ (1997ء)، " Representation: Cultural Representations and Signifying Practices "، لندن: سیج پبلیکیشنز، ص15۔

(4) آغا، وزیر (2000ء)، "ثقافت، ادب اور جمہوریت"، مشمولہ: معنی اور تناظر (مقالات)، نئی دہلی، انٹر نیشنل اردو پبلیکیشنز، ص44۔

(5)ہال، اسٹوارٹ (1997ء)، " Representation: Cultural Representations and Signifying Practices "، لندن: سیج پبلیکیشنز، ص15۔

(6) گرامشی، انٹونیو (1971ء)، " Selections from the Prison Notebooks "، لندن: انٹر نیشنل پبلیشرز، ص57۔

(7)اسپیواک، چکرورتی (1988ء)، " Can the Subaltern Speak?"، نیویارک: میتھیو اینڈرزن، ص104۔

(8)احمد، ڈاکٹر سہیل (1988ء)، " احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری"، لاہور، کتاب نگر، ص287۔

(9) قاسمی، احمد ندیم (1980ء)، "عالاں"، مشمولہ: نیلا پتھر (مجموعہ احمد ندیم قاسمی)، لاہور، سنگ میل پبلشرز، ص59۔

(10) قاسمی، احمد ندیم (1980ء)، "وحشی"، مشمولہ: مجموعہ احمد ندیم قاسمی، لاہور، سنگ میل پبلشرز، ص259۔